معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جنوری- جون ۲۰۰۹ء

علامہ اقبال کے ایک مکتوب اور مکتوب الیہ کی دریافت

خالد محمود سنجرانی*

مشاہیر کے مکاتیب اور ذاتی کاغذات ان کے اسلوبِ حیات اور طرزِ فکر کی تفہیم میں اس حد تک اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی تلاش، تدوین، اشاعت اور ان کے ذریعے نتائج کے اخذ کرنے کا عمل ان کی زندگی ہی میں شروع ہو جاتا ہے۔ ''مکاتیبِ غالب اور دیگر اکابر کے مکاتیب'' اس کی روشن مثال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کی پہلی نظر مشاہیر کے مکاتیب اور دستاویزات کی تلاش کے لیے ہی اُٹھتی ہے اور اس پہلو پر ارتکاز اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ایک آدھ دہائی میں ہی یہ عمل مکمل ہونے کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کے خطوط کی تلاش اور انھیں ترتیب دینے کا عمل بڑی عرق ریزی کے ساتھ شروع ہوا۔ چوں کہ ان کے مکاتیب کا بڑا ذخیرہ جنوبی ایشیا میں موجود تھا اور ان کے مکتوب الیہان کو بھی ان کی تاریخی اہمیت کا احساس تھا، اس لیے نہ صرف وہ محفوظ رہ گئے بلکہ ان تک رسائی حاصل کرنا بھی زیادہ دشوار نہ ہوا۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ یورپ میں بھی علامہ اقبال کے مکاتیب کی بازیافت بتدریج ہوتی رہی لیکن اتفاق سے علامہ اقبال کے کچھ ایسے یورپی احباب اس عمل سے بے نیاز رہے جو اقبال سے راست جڑے ہوئے تھے اور نہ ہی جنوبی ایشیا کی علمی و ادبی فضا ان سے زیادہ شناسا تھی۔ اس نوع کی دو مثالیں اس وقت میرے پیشِ نظر ہیں، اول بیرن فان والتھائیم ہنس ہاسو (Baron von Veltheim Hans-Hasso) جب کہ دوسری شخصیت پروفیسر گلاسنیپ (Prof.Glasenapp) کی ہے۔ مجھے قدرے دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ پروفیسر گلاسنیپ کے تمام ذاتی کاغذات، لائبریری اور دیگر دستاویزات جنگ کے زمانے میں تلف ہو گئی تھیں جب کہ وہ نہ صرف اقبال کے اہم معاصر، مترجم اور ان کے ملنے والوں میں سے تھے بلکہ جرمنی میں ہندیات کے بہت بڑے ماہر اور نقاد بھی تھے کہ جنھیں آج بھی جرمنی میں بہت عزت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ میں نے جرمنی کے ہر اہم آرکائیو کے ساتھ ساتھ پروفیسر گلاسنیپ فاؤنڈیشن سے بھی رابطہ کیا جس کا مقصد ان کے کاغذات میں سے اقبال کے خطوط کی تلاش کرنا تھا لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ پروفیسر گلاسنیپ کے کاغذات تلف ہو جانے کے سبب دستیاب نہیں۔ ان کاغذات کے تلف ہو جانے کے ساتھ ہی ان میں اقبال کے مکاتیب وغیرہ کی موجودگی کا امکان بھی ختم ہو گیا۔

جرمنی میں اقبال کے ایک اور دوست کی مثال بیرن فان والتھائیم ہنس ہاسو کی ہے۔ ہنس ہاسو مال دار ہونے کے ساتھ ساتھ از حد منظّم شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کی ہدایت پر ان کی جاگیر کا انتظام سنبھالنے والے دفتر نے ان کے محل میں موجود لائبریری میں ان کے اور ان کے احباب کے خطوط اور کاغذات کو بڑے سلیقے کے ساتھ محفوظ کیا ہوا تھا، جو ان کی وفات کے بعد برلن کے قدرے نزدیک واقع ہالے یونیورسٹی کے کتب خانے اور ہالے (Halle-Salle) سے لگ بھگ ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ایک چھوٹے سے قصبے وینیری

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ، یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ، جرمنی، استاد، شعبۂ اُردو، جی سی یونی ورسٹی، لاہور

گورڈے(Wernigerode) کی لنڈس آرکائیو میں منتقل کر دئے گئے تھے، جو تا حال وہیں موجود ہیں۔لنڈس آرکائیو میں موجود ہنس ہاسو کے کاغذات میں LHASA,MD,Rep.H Ostrau II, Nr.1104 کے تحت سر محمد اقبال کے نام سے ایک فائل موجود ہے۔اس فائل میں علامہ اقبال کا ایک انگریزی خط بنام ہنس ہاسو جوابی مکتوب کے ساتھ موجود ہے۔ان دونوں خطوط کی نقول میں اصل متن کے پیچھے آرکائیو کی مہر ثبت ہے جسے متن کا حصہ نہ سمجھا جائے۔علامہ اقبال کا خط انگریزی زبان میں جب کہ ہنس ہاسو کا جوابی خط جرمن زبان میں ہے کہ جس کے اردو ترجمے کے لیے راقم اپنے دوست بلیک واٹکنس (Blake Watkins) کی معاونت اور اپنی نگران ڈاکٹر کرسٹینا کی نظر ثانی کے لیے از حد ممنون ہے۔اس مقالے میں ہنس ہاسو کے خط کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔دونوں مکاتیب کے وضاحت طلب مقامات پر حواشی درج کیے گئے ہیں اور حواشی کے ماخذات کی نشان دہی ان کے آخر میں قوسین میں کر دی گئی ہے جب کہ ماخذات کی تفصیل کتابیات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ہماری معلومات کے مطابق علامہ اقبال کا یہ خط نہ صرف غیر مطبوعہ ہے بلکہ اس کے جوابی مکتوب سے علامہ اقبال کے ایک نئے مکتوب الیہ کا علم ہوتا ہے۔

ذیل میں علامہ اقبال کے لکھے ہوئے خط کا عکس دیا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حواشی کے نمبر درج کرنے کی غرض سے اس کو ٹائپ بھی کیا گیا ہے۔ٹائپ کرنے کے مسائل کے سبب اردو عبارت میں حواشی کے نمبر بیت کی علامت جب کہ انگریزی متن میں قوسین کی علامت کے ساتھ دیے جا رہے ہیں۔علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط میں سبقتِ قلم کی وجہ سے ایک آدھ لفظ چھوٹ گیا تھا جس کو قیاس کی بنا پر متن کے ساتھ قوسین میں درج کیا گیا ہے۔ٹائپ شدہ خط کی ہر لائن میں موجود الفاظ کی تعداد علامہ اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اصل خط کے مطابق ہے۔ذیل میں پہلے اقبال کے ہاتھ سے لکھے ہوئے خط کو پیش کیا جا رہا ہے:

found.

Lahore

30th june 1936

My dear Baron,(2)

Thank you so much for your beautiful P.C(3)which i recd.(recived in the) last mail.It will be a great honor to stay in your castle(4) & I shall, at least I hope to, avail myself of your hospitality(5) when I come to Germany which I have always regarded as the Fatherland (6)of my spirit.Do remember me to Prof. Iassenaps,(7) if he is still in your castle.I am looking forward to meeting him.But I fear it is not yet settled when I shall be able to leave (8) India.It may be next year(9).This year it does not seem to be possible as I have not been able to make proper arrangments(10) for my children(11) who lost their mother(12) last year.I am trying to get hold of a good governess(13).As soon as I find one(14) I shall make preparations to visit Germany once more(15).

Deutachland Über Alles(16).

Yours sincerely

Muhammad Iqbal

اب ذیل میں اقبال کے اس خط کے جواب میں ہنس ہاسو کا جرمن مکتوب اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

not found.

۲۲ جولائی، ۱۹۳۶ء

عظیم المرتبت شاعر اور میرے عزیز دوست!

لاہور سے ۳۰ جون کو لکھا ہوا آپ کا بہت ہی پیارا خط ۱ ملا جس سے مجھے ناقابل بیان خوشی ہوئی ہے لیکن میں یہ پڑھ کر اداس بھی ہوا ہوں کہ آپ اس سال یورپ، جرمنی اور آسٹراؤ نہیں آسکتے۔ میں نے آپ کی نیک خواہشات ہم دونوں کے مشترکہ دوست پروفیسر فان گلا سنیپ (Prof. von Glasenapp) تک فوراً بھجوادی تھیں، جس کی ایک کاربن کاپی ۱۸ اس خط کے ساتھ آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیج رہا ہوں۔

مجھے لندن میں ''ورلڈ کانگریس آف فیتھ'' ۱۹ کے موقع پر آپ سے ملنے کی بڑی امید تھی۔ اس کانفرنس میں آپ کے ملک سے اور لاہور سے بھی کئی اہم شخصیات ۲۰ نے شرکت کی اور عمدہ تقریریں کیں۔

میں اس امید کے ساتھ آپ کو آسٹراؤ کے بارے میں ایک معلوماتی کتابچہ ۲۱ ارسال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ کتابچہ آسٹراؤ کے بارے میں نہ صرف آپ کو معلومات فراہم کرے گا بلکہ آپ کے اس متوقع سفر کے عزم میں تقویت بھی پیدا کرے گا۔

براہِ کرم آپ ہمارے مشترکہ احباب مسٹر وسوگر ۲۲، سر اور لیڈی دلیپ سنگھ ۲۳ کو میرا سلام کہیے۔ پیر و مرشد، جیسا کہ آپ نے اپنے گذشتہ خط کا اختتام ''Deutschland uber alles'' کے کلمات سے کیا تھا، مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کے جواب میں آپ ہی کے خوبصورت اشعار درج کرتے ہوئے اس خط کا اختتام کروں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
اقبالؔ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا ۲۴

اگرچہ آپ اپنے گلے کے علاج ۲۵ کے لیے یورپ تشریف نہ لا سکے ۲۶ لیکن مجھے امید ہے کہ اب آپ کی آواز بہت حد تک بہتر ہوگی۔

دل کی گہرائیوں سے سلام،
آپ کا اور آپ کے کلام کا مداح
(دستخط، ہنس ہاسو بیرن فان والتھائیم)

حواشی

۱۔ لنڈس آرکائیو، جرمنی سے موصول شدہ، علامہ اقبال کے خط پر کچھ نمبر اور مہروں کے نشانات وغیرہ موجود ہیں کہ جن کی وضاحت ضروری ہے۔ خط کے اوپری بائیں سمت میں قلم سے 148 کا ہندسہ درج ہے۔ یہ ہندسہ اصل

خط کے صفحے پر بھی موجود ہے کہ جسے ہنس ہاسو کی جاگیر کا انتظام سنبھالنے والے دفتر کی جانب سے سہولت کی غرض سے درج کیا گیاہو گا۔خط کی اوپری دائیں سمت میں ایک مہر کا نشان موجود ہے، اس کا متن ہے : Dr.H.H.v.V.Rentamt 22.Jul.36 Ostrau 22.7.-- یہاں Dr.H.H.v.V. سے مراد ڈاکٹر ہنس ہاسو فان والتھائیم ہیں جب کہ Rentamt سے مراد جاگیر کاانتظام کرنے والا دفتر ہے۔ہنس ہاسو اپنے کاغذات کو بڑے سلیقے سے رکھتے تھے اور ہر خط اور دستاویز پر مہر لگا کر اس کے موصول ہونے کی تاریخ بھی درج کیا کرتے تھے،اس لیے 22.jul. 36 سے خط کے موصول ہونے کی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔اس مہر کانشان اصل خط پر بھی موجود ہے۔ خط کے متن کے پیچھے دھندلی سی ایک مہر کا نشان بھی ہے کہ جو اصل خط میں موجودنہیں ،یہ صرف موصو ل ہونے والی عکسی نقل میں دکھائی دیا ہے۔اس مہر کی عبارت یہ ہے : Kopie Landeshauptarchiv Sachsen-Anhalt (Nur zum eigen Gebrauch für Dr.Khalid Sanjarani,Weitergabe nur mit Genehrigunh des Landeshhauptrchivs.) جس کے معانی یہ ہیں کہ یہ خط صرف راقم (میرا نام) کے لیے ہے اور اس خط کو آپ ہماری اجازت کے بغیر کسی اور کو نہیں دے سکتے ،علاوہ ازیں آرکائیو کا نام اس میں شامل ہے۔

خط کے آخر میں حاشیے کی صورت میں tiernachweis:LHASA,MD,Rep. H Ostrau II, Nr.1104 دراصل آرکائیو کا حوالہ نمبر ہے جو اصل خط پر درج نہیں ہے۔

۲۔ بیرن (Baron) قدیم فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جو پرانی جرمن اور اطالوی کے لفظ بیرو (Baro) سے ماخوذ ہے،جس کے معانی جنگجو اور آزاد انسان کے ہیں۔ بیرن جرمنی کے اشرافیہ کا کم تر خطاب ہے۔ریپبلکن جرمنی سے قبل یہ خطاب خاندانوں کے شرف و وقار کی علامت تھا۔۱۱ اگست ۱۹۱۹ء میں ویمر کی قانونی اصلاحات کی رو سے جرمنی کے تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں قرار دیے گئے اور خطابات یافتہ خاندانوں کو حاصل شدہ قانونی مراعات اور سماجی منزلت کا خاتمہ کر دیا گیا۔اس لیے ۱۹۱۹ء کے بعد اپنے نام کے ساتھ خاندانی خطاب لکھنے کا رواج بھی ختم ہو گیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس سے شاید آگاہ نہ تھے اور اگر تھے بھی تو انھوں نے اس امر کا خیال رکھنا ضروری نہ سمجھا۔ہم نے مکتوب الیہ کے بہت سے ذاتی اور سرکاری کاغذات دیکھے ہیں،وہ خود کسی بھی جگہ اپنے آپ کو بیرن نہیں لکھتے تھے۔

اقبال کے مکتوب الیہ کا مکمل نام ہنس ہاسو فان والتھائیم ہے۔ جنوبی ایشیا میں انھیں بیرن فان والتھائیم ہنس ہاسو بھی لکھا گیا ہے (Civil and Militray Gazette,22 April,1938) ہنس ہاسو جرمنی کے شہر کلون میں ۱۵ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ہالے یونیورسٹی، جرمنی کی لائبریری میں موجود ان کی تعلیمی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ تک میونخ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ علامہ اقبال میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کی غرض سے جولائی کے تیسرے ہفتے جرمنی پہنچ گئے تھے۔اگرچہ ان کا قیام ہائیڈل برگ میں رہا لیکن میونخ سے بھی ان کا رابطہ برقرار تھا۔قرائن بتاتے ہیں کہ علامہ اقبال اور ہنس ہاسو کے مابین اولین ملاقات میونخ یونیورسٹی ہی میں ہوئی ہو گی۔ہنس ہاسو کا طبعی

رجحان فلسفے خصوصاً بدھ مت، ہندومت اور جنوبی ایشیا کے تہذیبی علوم کی طرف زیادہ تھا جس کی تصدیق ان کی تعلیمی دستاویزات سے ہوتی ہے۔فلسفہ اقبال اور ہنس ہاسو کا مشترکہ موضوع تھا۔دونوں ایک ہی تعلیمی ادارے میں موجود تھے۔اس لیے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اقبال اور ہنس ہاسو کے مابین جو روابط آگے چل کر مستحکم ہوئے،ان کی بنیاد میونخ ہی میں پڑی تھی۔

ہنس ہاسو کے تعلیمی کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۲۱ جون ۱۹۱۲ء کو میونخ یونیورسٹی سے آرٹ ہسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی (LHASA, MD,Rep.H Ostrau II, Nr.27) آرٹ ہسٹری ان کا بنیادی مضمون تھا،ثانوی مضامین میں انھوں نے تاریخ اور انگریزی زبان وادب کا مضمون منتخب کیا تھا۔میونخ یونیورسٹی میں ان کا داخلہ ۱۵ مئی ۱۹۰۷ء کو ہوا تھا۔۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۱ء تک انھوں نے یونانی تاریخ، جرمن تاریخ،گلدان پر مصوری کا فن،اطالوی،ہالینڈ اور انیسویں صدی میں مصوری کی تاریخ،بدھ مت مصوری کی روشنی میں ،ایرانی مصوری کی تاریخ،مائیکل اینجلو ۔نشاۃ الثانیہ میں ،وینس، روم، جرمنی،فرانس اور فلورنس کا آرٹ،انیسویں صدی کی تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ بنک اور سٹاک مارکیٹ کا ایک کورس بھی پڑھا تھا مزید تفصیل کے لئے دیکھیے: (Hans Hasso von Veltheim-Eine Biographei by Karl Klaus P.35-38)۔ان کے مضامین کے انتخاب کے علاوہ ان کا فکری جھکاؤ انھیں بہت جلد علامہ اقبال کے قریب لے آیا ہوگا۔

۱۹۰۷ء کے بعد علامہ اقبال تو دوبارہ جرمنی نہ جا سکے لیکن ہنس ہاسو نے جنوبی ایشیا کی سیاحت کے دوران علامہ اقبال سے ان کی رہائش گاہ پر دو ملاقاتیں کی تھیں جن میں سے آخری ملاقات خاصی اہم ہے اور اس ملاقات کا احوال ہنس ہاسو نے اپنی ڈائری میں بھی درج کیا تھا۔ان کی ڈائری تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے جب کہ اصل مسودہ ہالے یونیورسٹی، جرمنی کی لائبریری میں موجود ہے۔اس اصل مسودے میں سے اقبال سے ملاقات والے حصے کی نقل راقم کے پاس موجود ہے۔ہنس ہاسو کے حالاتِ زندگی کی مزید تفصیل حواشی میں درج کرنا ممکن نہیں کہ یہ مقالہ زیادہ طوالت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

۳۔　اس انگریزی مخفف سے مراد پوسٹل کارڈ ہے جس کی وضاحت ہنس ہاسو کی مطبوعہ ڈائری سے ہوتی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''انھوں (اقبال) نے کمال محبت سے میرے ارسال کردہ اُس کارڈ کا شکریہ ادا کیا جو میں نے جنوری میں ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر بھیجا تھا۔'' (Tagebüchar aur Asien,Vol.1,P.138) معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۸۷۶ء کے حساب ۱۹۳۶ء کو اقبال کی ساٹھویں سالگرہ متصور کیا جو کہ غلط ہے۔یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہائیڈل برگ میں علامہ اقبال کی رہائش گاہ کے باہر جو یادگاری تختی ستمبر ۱۹۶۶ کو نصب کی گئی تھی،اس میں بھی اقبال کا سالِ پیدائش ۱۸۷۶ء کندہ تھا جس کی بعد میں اصلاح کی گئی تھی۔موجودہ یادگار پر ۱۸۷۷ء ہی کی تاریخ درج ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدتوں تک اقبال کا سالِ پیدائش ۱۸۷۶ء ہی سمجھا جاتا رہا اور اسی برس کی مناسبت سے ہنس ہاسو نے انھیں ۱۹۳۶ء میں ساٹھویں سالگرہ کا کارڈ ارسال کیا تھا۔

پوسٹل کارڈ ملنے پر اقبال کا تشکر بہ ظاہر معمولی واقعہ ہے لیکن اسی نوع کے چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے شخصیت کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔۲۰ اپریل ۱۹۳۶ء کی شام کو جب ہنس ہاسو اقبال سے ملنے کے لیے جاوید منزل گئے تو وہ اقبال کی زندگی کی آخری شام تھی۔مسلسل علالت میں رہنے کے باعث اگرچہ وہ اس وقت شدید تکلیف کے عالم میں تھے لیکن اس عالم میں بھی انھیں وہ پوسٹل

کارڈ نہ صرف یاد تھا بلکہ انھوں نے اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔

۴۔ یہ محل جو آسٹراؤ محل کے نام سے جانا جاتا ہے جرمنی کے شہر ہالے کی شمالی سمت میں چند کلومیٹر کی مسافت پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے آسٹراؤ میں موجود ہے۔ یہ محل اور قصبہ ہنس ہاسو کو مورثی جاگیر میں ملا تھا۔ ہنس ہاسو کے اجداد سلوا کیہ سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ۱۵۵۸ء میں اس خاندان نے اپنی حیثیت کو مستحکم کرتے ہوئے موجودہ محل کی جگہ اور اس کے اطراف کی زمینوں کو خرید لیا تھا۔ اس محل کی تعمیر ۱۷۱۳ء میں ہنس ہاسو کے اجداد میں سے ایک بزرگ اوٹو لیوڈوگ (Otto Ludwig) کے ہاتھوں ہوئی۔ انھوں نے فرانسیسی ماہرِ تعمیرات سے اس کا نقشہ بنوایا جس میں محل کے چاروں طرف ایک گہری نہر دفاعی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس محل کا مالک نہ صرف اطراف کی زمینوں بلکہ ان پر بسنے والے خاندانوں کے ہر معاملے کا ذمہ دار ہوتا تھا اور اسے اپنے علاقے میں بے حد احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ آسٹراؤ محل کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے (Schloss Ostrau bei Halle-Saale von Bruno Goetz,Halle,Otto Hendel-Druckerei,N.D,P.1-53) راقم کو ۲۶ مارچ ۲۰۰۹ء کو علامہ اقبال اور ہنس ہاسو کے مابین روابط کی تحقیق کی غرض سے جرمنی کے کچھ دانشوروں کی معیت میں اس محل میں جانے کا موقع ملا تھا۔ آج کل یہ محل ایک فلاحی تنظیم کی نگرانی میں ہے۔ یہی وجہ ہے اس محل کے ایک حصے کو بچوں کے سکول لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ اس تنظیم کے چیئرمین نے راقم کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ہنس ہاسو کی زندگی میں یہ محل ادبی اور فکری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ محل مشرق و مغرب کا حسین امتزاج پیش کرے اور وہ اپنی زندگی میں اس حوالے سے خاصے کامیاب بھی ہوئے۔ چیئرمین نے مہمانوں کے تاثرات پر مبنی پرانی کتاب راقم کو دکھائی جس میں مشرقی مہمانوں کی خاصی بڑی تعداد کے تاثرات موجود تھے۔ ہنس ہاسو کے دور میں مشرق سے آنے والے لوگ سیاست، فلسفہ، سائنس اور شعر و ادب کی دنیا سے متعلق تھے۔ انھوں نے اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے علامہ اقبال کو اپنے محل میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ اس محل کے قریب واقع والتھائیم خاندان کے گرجا گھر سے متصل ایک کمرے میں علامہ اقبال کی ایک تصویر بھی آویزاں ہے۔

۵۔ ہنس ہاسو مشرق و مغرب کے مفکرین بالخصوص فنونِ لطیفہ سے وابستہ افراد میں عمدہ میزبان کے طور پر مشہور تھے۔ ان کی ایک ہم عصر اس بارے میں بتاتی ہیں: ''وہاں جانے کے بعد میزبان کے خلوص اور محبت کا تاثر اتنا گہرا ہوتا تھا جو کبھی محو نہیں ہو پاتا تھا اور یہ تاثر ایک ایسے شخص کا تھا جو دنیا میں کم یاب ہو۔ وہ اپنے مہمانوں کی عزتِ نفس، ذوقِ جمال، زندگی بسر کرنے کی ظاہری ہیئت کا خیال کرتے ہوئے خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتا تھا۔ انھیں اپنے نوادرات کو دوسروں کے سامنے متعارف کرانے کا ذوق حاصل تھا۔ ہنس ہاسو کچھ اس طور سے سمجھاتے کہ وہ ماضی کا ثبوت ہوتے ہوئے زندہ سانس کا درجہ اختیار کر لیتے تھے۔'' (Hans-Hasso von Veltheim by Rolf Italiaander,P.12) وہ اپنے محل میں مشرق و مغرب کے مفکرین کو مدعو کرتے رہتے تھے اور ان کے محل اور اس کے اطراف میں مہمانوں کی تفریح کا نہایت عمدہ انتظام تھا کہ جس کے مٹتے ہوئے نقش آج بھی اس محل کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ محل میں موجود مہمانوں کے تاثرات پر مبنی کتاب کے اوراق سے میزبان کے حسن سلوک اور محل کی فکری فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔ محل کے اطراف میں کئی خوب صورت روشیں ہیں کہ جنھیں کسی نہ کسی فلسفی کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ محل کے چاروں طرف بہتی ہوئی نہر کا پل پار کرتے ہی جو پہلی روش ملتی ہے اسے

Geote Weg کا نام دیا گیا ہے، روش کے آغاز ہی میں ایک خوب صورت پتھر پر گوئٹے کا نام کندہ ہے۔ یہ اہتمام ہر روش کے لئے ہے۔ علاوہ ازیں، ہنس ہاسو کی زندگی میں محل کے اندر نوادرات کا بڑا ذخیرہ موجود تھا جو وہاں آنے والوں کے لئے بہت کشش کا باعث تھا۔

۶۔ اس خط میں اقبال نے جرمنی کو ''روحانی طور پر اپنی آبائی سرزمین'' قرار دیا ہے۔ آپ ۳ جون ۱۹۰۸ء کو ایما ویگناسٹ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :''۔۔۔میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔'' (بہ حوالہ زندہ رود، ص ۱۵۲) اقبال پر جرمنی کے اثرات کا مطالعہ اقبالیات کا ایک اہم اور وسیع موضوع ہے کہ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ایما ویگناسٹ اور ہنس ہاسو کو لکھے جانے والے مکاتیب کے درمیان ۲۸ برس کا فاصلہ ہے لیکن ان دونوں خطوط میں جذبے کی شدت ایک سی ہے۔ اقبال اور جرمنی کے حوالے سے مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے: Iqabl and Europa,ed. J.C.Burgel, Bern, Peter Lang, 1980. and Muhammad Iqbal and Three Realms of the Spirit,Hamburg1978.

۷۔ پروفیسر گلاسنیپ (Prof. Glassenaps) کا پورا نام ہلمتھ فان گلاسنیپ (Prof.Helmuth von Glassenaps) ہے۔ ان کا شمار جرمنی کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ آپ ہندیات میں تخصیص رکھتے تھے اور اس موضوع پر کئی اہم کتب کے مصنف ہیں۔ اس حوالے سے جرمنی میں ان کا نام بے حد معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے نام سے ایک فاؤنڈیشن بھی کام کر رہی ہے۔ پروفیسر گلاسنیپ ۲۳ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پروفیسر بنارسی داس کی وساطت سے علامہ اقبال سے ان کی رہائش گاہ پر ملے تھے۔ اس ملاقات کا احوال ان کی خودنوشت سوانح عمری Meine Lebensreise کے صفحہ نمبر ۱۳۴ پر موجود ہے۔ اس سوانح عمری سے پتا چلتا ہے کہ آپ اپنے والد اور امراؤ سنگھ کی وساطت سے علامہ اقبال کی شاعری اور معنی آفرینی سے روشناس ہوئے تھے۔ انھوں نے اوائل عمری ہی میں اقبال کی نظم ''ایک شام'' کو جرمن زبان میں ڈھالا تھا۔ اردو اور ہندی شاعری سے ان کا یہ شغف آگے چل کر ''چار ہزار سالوں کی ہندوستانی نظمیں'' کی صورت میں سامنے آیا کہ جس میں انھوں نے ویدوں سے لے کر معاصر ہندوستانی ادب تک کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ان کی اس سوانح عمری سے معلوم ہوتا ہے آپ ۱۹۵۶ء میں جب کراچی تشریف لائے تھے تو اقبال کی یاد میں منعقدہ ایک تقریب میں اقبال کی چند اردو نظموں کا جرمن ترجمہ پڑھ کر سنایا تھا اور اقبال سے اپنی ملاقات کے لمحات سے جڑی ہوئی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں مزید تفصیل کے لئے دیکھیے: (Meine Lebensreise, Wiesbaden, F.A Broekhaus, 1964)

۸۔ علامہ اقبال نے ایما ویگناسٹ کو جو خطوط تحریر کیے تھے، ان میں جرمنی جانے کی امنگ ماہرین اقبال سے پوشیدہ نہیں۔ اس خط میں بھی یہی امنگ ایک اور ڈھب سے امڈتی ہوئی نظر آتی ہے۔

۹۔ ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبال کے ہاں اپنی روز افزوں علالت کی وجہ سے اپنی ذات پر (بیرون ملک سفر کے لئے) رقم خرچ کرنے کے حوالے سے ایک خاص رویہ جنم لے چکا تھا اور وہ اسے اپنے بچوں کی حق تلفی سمجھنے لگے تھے۔ اسی رویے، اپنی علالت اور مصروفیت کے سبب آپ خواہش کے باوجود جرمنی نہ جا سکے۔

۱۰۔ سردار بیگم کی وفات (۲۳ مئی ۱۹۳۵ء) سے لے کر لگ بھگ مئی، جون ۱۹۳۷ء تک علامہ اقبال اپنے کم سن بچوں، جاوید اقبال اور

منیرہ کی نگہداشت کے لیے مستقل بندوبست نہ کر سکے تھے۔اس عرصے میں انھوں نے اخبارات میں مسلمان گورنس کے لئے اشتہارات دیئے،احباب کوخطوط لکھے۔یہ عرصہ ان کے لئے خاصی پریشانی کا عرصہ رہا جس میں ان کے لیے بچوں کو چھوڑ کر کہیں جانا ممکن نہ تھا۔اگر لاہور سے کہیں باہر جانا ہوتا تو جاوید کو ساتھ لے کر جاتے۔خود جاوید اقبال کا بیان ہے کہ اس عرصے میں ننھیال کی طرف سے نزدیکی رشتہ دار خواجہ عبدالغنی ہی تھے جو ہمارے ساتھ رہ سکتے تھے لیکن وہ کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہتے تھے۔اقبال کے خاندان میں سے خواتین کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر لاہور آ جانا اور ان بچوں کے ساتھ رہنا آسان نہیں تھا۔اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مخصوص مدت کے لیے آ جاتا تھا۔جاوید اقبال کے مطابق شیخ عطا محمد اور ان کی اہلیہ کے علاوہ اقبال کی چھوٹی بہنوں کریم بی بی یا زینب بی بی میں سے کوئی ایک رہ لیا کرتا تھا۔شیخ عطا محمد کے بیٹے اعجاز احمد اور ان کی اہلیہ بھی کچھ دنوں کے لیے بچوں کے پاس آ کر رہیں۔تاہم یہ سارے بندوبست عارضی تھے اور اسی وجہ سے جاوید اور منیرہ کسی سے مانوس نہ پاتے تھے۔(زندہ رود،ص۶۰۹)

۱۱۔ بچوں سے مراد جاوید اقبال اور منیرہ اقبال ہیں کہ جنہیں علامہ اقبال پیار سے ''بابا'' اور ''بی'' کہتے تھے۔دونوں بچے اپنی والدہ، سردار بیگم کے انتقال کے وقت کم سن تھے۔والدہ کی وفات پر دونوں بچوں کا ردعمل خاموش لیکن از حد گہرا تھا۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:(زندہ رود،ص۶۰۸)

۱۲۔ اس سے مراد جاوید اقبال اور منیرہ کی والدہ سردار بیگم ہیں جن کی وفات مئی ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔انھوں نے علامہ اقبال کے ساتھ کم وبیش ۲۲ برس کا عرصہ گزارا۔ان کی وفات نے اس گھرانے کے افراد جو اثر ڈالا،اس کی تفصیل کے لئے دیکھیے:(زندہ رود از جاوید اقبال،ص۲۰۷) آپ لاہور کے موچی دروازے کے متوسط کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔علامہ اقبال سے ان کا نکاح ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا لیکن رخصتی عمل نہ آئی تھی۔چند گمنام خطوط کے باعث رخصتی کا معاملہ مزید التوا کا شکار ہو گیا۔سردار بیگم کے اقبال کے نام خط،اقبال کے والد کے استخارے،مرزا جلال الدین اور اقبال کے چند دیگر چند دوستوں کی تحقیق کی روشنی میں علامہ اقبال نے مختار بیگم کی مشاورت اور رضامندی سے سردار بیگم سے اگست یا ستمبر ۱۹۱۳ء میں دوبارہ نکاح کیا۔اگر دیکھا جائے تو سردار بیگم ہی نے اقبال کے ساتھ اپنی ساری زندگی شریکِ حیات کے طور پر بسر کی۔سردار بیگم کے اقبال سے نکاح اور رخصتی میں تاخیر کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:(روایاتِ اقبال از عبداللہ چغتائی،ص ۱۲۸،۱۲۹۔ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک، ص۶۷۔۷۱، زندہ رود از جاوید اقبال،ص۲۰۳،۲۰۴)

۱۳۔ اس عہد میں گورنس کے لئے اخبارات میں دیئے جانے والے اشتہارات اور احباب کے نام اقبال کے مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کسی مسلمان گورنس کی تلاش میں تھے جو اسلامی معاشرت سے واقف ہو،اردو زبان پر قدرے عبور رکھتی ہو،انتظام خانہ داری اور تربیتِ اطفال میں سلیقہ مند اور اچھی انتظامی صلاحیتوں کی مالک ہو۔گورنس کے انتظام میں اقبال کو دو برس کا عرصہ لگا۔(ذکر اقبال از عبدالمجید سالک،ص۲۱۲)

۱۴۔ ۱۹۳۷ء میں رشید احمد صدیقی کی وساطت سے اقبال نے اپنے بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک جرمن خاتون مسز ڈورس کی خدمات حاصل کیں۔اس بارے میں عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:''۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اہلیہ کی بہن جو جرمن خاتون ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے بھی واقف تھی اور اردو بھی بول لیتی تھی،جاوید اور منیرہ کی گورنس مقرر کی گئی

اس وقت جاوید کی عمر تقریباً تیرہ سال اور منیرہ کی تقریباً سات سال ہوگی۔ یہ خاتون علامہ کے انتظام خانہ داری اور تربیتِ اطفال میں بے حد خوش سلیقہ اور منتظم ثابت ہوئیں'' (ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک، ص۲۱۲) جاوید اقبال نے مسز ڈورس کی آمد کے بعد گھر میں پیدا ہونے والی خوش گوار تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''مسز ڈورس احمد کے گھر میں آنے سے جاوید منزل کے سب مکینوں کی گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی ۔۔۔راقم اور منیرہ کو احساس ہوا کہ سب ایک خاندان کے رکن ہیں۔'' (زندہ رود از جاوید اقبال، ص۶۷۴)

۱۵۔ علامہ اقبال جرمنی دوبارہ جانے کے لئے بے حد گرم جوشی کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن انھیں دوبارہ جانے کا موقع نہ مل سکا، حتیٰ کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر بھی اور ایک آدھ اور موقع پر آپ پیرس اور اٹلی سے ہو کر آگے چلے گئے لیکن جرمنی نہ جا سکے۔ ممکن ہے کہ ہند میں برطانوی حکومت کا تسلط ہونے کے سبب اور اس زمانے میں جرمنی میں ہٹلر کی حکومت قائم ہونے ایسے عوامل آڑے آئے ہوں۔

۱۶۔ علامہ اقبال نے اپنے خط کا اختتام جرمنی کے قومی ترانے کے اس اولیں مصرعے سے کیا کہ جو تیس کی دہائی میں جرمنی کے در و دیوار سے گونجتا تھا۔ اس کے انگریزی معانی Germany over and above all کے ہیں۔ یہ مصرع جرمنی کے قومی ترانے کا پہلا مصرع ہے جو اب رائج نہیں۔ ذیل میں اس ترانے کے پہلے بند کا انگریزی ترجمہ درج کیا جا رہا ہے۔

Germany,Germany over and obove
all Above all in the world,
If it always sats together
Brotherly for protection,
From tha Mass to the Memel,
From the Etsch up to the Belt,
Germany,Germany over and above all,
Above all in the world!

چوبیس مصرعوں اور تین بندوں پر مشتمل اس ترانے کے شاعر ہاف مین فان فالرسلبین ہیں۔ انھوں نے ۱۸۴۱ء میں یہ ترانہ تحریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ جرمن قوم الگ الگ ریاستوں میں منقسم نہ رہے بلکہ قومیت کی بنا پر ایک ہی ریاست کی تشکیل کرے۔ ہاف مین ان شعرا میں سے تھا جو متحد اور آزاد جرمنی کا خواب دیکھتے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے اس ترانے میں پیش کئے گئے انقلابی خیالات کی وجہ سے اسے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ شاعر کے ہاتھ سے لکھا ہوا یہ ترانہ ایک قیمتی مخطوطے کی صورت میں پولینڈ کے شہر کراکوف (Krakow) کی برلنکا کولیکشن میں موجود ہے۔ اس گیت کو ۱۹۲۲ء میں جرمنی میں انقلابی روایت کے احیاء کے دوران قومی ترانے کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء سے لے کر آج تک یہ گیت کبھی مکمل تو کبھی ایک آدھ بند کی صورت میں قومی ترانے کے طور پر پڑھا اور گایا جاتا رہا ہے۔ نازی دور میں اس کا پہلا بند، ۱۹۵۲ء میں مغربی جرمنی میں اس کا تیسرا بند جب کہ ۱۹۹۱ء میں جرمنی کے اتحاد کے بعد اس گیت کے تیسرے بند کو قومی ترانے کا درجہ حاصل ہے۔ یہ گیت

جوزف ہائیڈن کی دھن پر گایا جاتا ہے۔ جوزف ہائیڈن نے یہ دھن ۱۷۹۷ء میں روم کے شہنشاہ فرانسس دوم کی سالگرہ کے موقع پر ترتیب دی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں رومن شہنشاہت کے خاتمے کے بعد اس دھن کو آسٹریا کی بادشاہت میں بجایا جاتا رہا اور بعد ازاں اسی دھن پر ہاف مین نے گیت تحریر کیا کہ جسے جرمنی کے قومی گیت کا درجہ حاصل ہوا۔ دیگر تفصیلات کے لئے دیکھیے: (The National Anthem Debate in the Federal Republic of Germany by Margarete Myers Feinstein, P. 505)

جرمنی میں نازی دور کے خاتمے کے بعد اس گیت کا پہلا بند نہیں پڑھا جاتا۔ راقم نے اس موضوع پر کئی جرمن دانشوروں، اساتذہ اور طلبہ سے مکالمہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس گیت کے پہلے بند بالخصوص پہلے مصرعے Deutachland Über Alles سے شدت کے ساتھ قوم پرستانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور ہٹلر کے تلخ زمانے کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں جرمن قوم اب شعوری سطح پر قوم پرست روّیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ نوجوانوں کا خیال ہے کہ اب ہم جرمنی کی بجائے عظیم یورپ کے بارے میں سوچ رہے ہیں جس میں اس طرح کے مصرعوں اور قوم پرستانہ جذبات کی حامل شاعری کی کوئی گنجائش موجود نہیں جب کہ جرمنی میں عرصے سے مقیم غیر ملکی دانشوروں کا خیال ہے کہ جرمن قوم لاکھ انکار کرتی رہے لیکن لاشعوری سطح پر یہ مصرعہ ان کے باطن کے تہہ خانوں میں اب بھی گونجتا ہے۔

۱۷۔ مکتوبِ اقبال بہ نام ہنس ہاسو محررہ ۳۰ جون ۱۹۳۶ء۔

۱۸۔ ہنس ہاسو کے جوابی خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲۲ جولائی کو جب علامہ اقبال کا خط ہنس ہاسو کو ملا تو پروفیسر گلاسنیپ ان کے محل سے جا چکے تھے۔ ہنس ہاسو نے اقبال کی نیک تمنائیں اور ملنے کی خواہش کے بارے میں پروفیسر گلاسنیپ کو خط لکھ کر آگاہ کیا تھا اور اس خط کی کاربن کاپی علامہ اقبال کے ملاحظے کے لیے اپنے خط کے ساتھ روانہ کر دی تھی۔ لنڈس آرکائیو میں اس کاربن کاپی کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ ہنس ہاسو قلم کی بجائے ٹائپ رائٹر استعمال کرتے تھے جس میں کاربن کاپی بنانا آسان ہوتا ہے۔

۱۹۔ ''ورلڈ کانگریس آف فیتھ'' ۳ جولائی ۱۹۳۶ء سے ۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء تک لندن میں منعقد ہوئی تھی جس میں دنیا بھر سے مختلف مذاہب کے علماء اور مفکرین نے شمولیت کی تھی۔ اس کانگریس کا مقصد مختلف مذاہب کے مابین ہم آہنگی کی فضا کو پیدا کرنا تھا۔ نہ جانے اس طرح کی کاوشیں بے ثمر کیوں رہیں۔ برطانیہ میں یہ تنظیم اب بھی خاصی فعال ہے۔ ۱۹۳۶ء کے سیمینار اور اس تنظیم کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: (Interfaith Orginizations-1893-1979, by Marcus Braybrooke)

۲۰۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال کے نہایت قریبی دوست سر عبدالقادر کے علاوہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل یوسف علی، سردار موہن سنگھ، آغا خان اور ڈاکٹر ایس۔ این۔ داس گپتا نے خطاب کیا تھا۔ اس کانفرنس میں مقالات پڑھنے والوں میں ہنس ہاسو کا نام ہمیں نظر نہیں آیا، ممکن ہے کہ انھوں نے مصر کی حیثیت سے شرکت کی ہو۔

۲۱۔ آسٹراؤ محل کے بارے میں یہ کتابچہ جرمن زبان میں ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر "Schloss Ostrau" کا عنوان دیا گیا ہے جس کے معنی آسٹراؤ محل کے ہیں۔ اس عنوان کے اوپر محل کا مونوگرام چھپا ہے جو ہنس ہاسو نے بنوایا تھا۔ اس کتابچے کو محل کے اندرونی اور بیرونی حصوں کی خوب صورت تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ اس میں محل کی تاریخ کے ساتھ ساتھ

والتھائیم خاندان کا مختصر پس منظر بھی درج ہے۔محل میں موجود نوادرات کی فہرست اور چند تصاویر کے علاوہ مہمانوں کی تاثراتی کتاب سے کچھ اقتباسات اس میں شامل کئے گئے ہیں۔چند ایک تاثرات منظوم بھی ہیں۔راقم دسمبر ۲۰۰۸ء میں جب اس محل کو دیکھنے کے لئے آسٹراؤ گیا تھا تو واپسی پر میزبانوں نے جن چند روایتی تحائف سے مجھے سرفراز کیا،ان میں یہ کتابچہ بھی شامل ہے۔

۲۲۔ مسٹر اور مسز وسوگر کے بارے میں عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں :''علامہ اپنی موٹر میں ہمیں فین روڈ پر لائے اور بخشی ٹیک چند کے مکان کے بالمقابل ذرا اندر کر کے ایک مکان کے سامنے اتر گئے۔یہاں ایک پارسی میاں بیوی مسٹر و مسز وسوگر رہتے تھے جن کے ہاں ان دنوں اٹلی کے ایک سکالر ڈاکٹر سکارپا آئے ہوئے تھے۔۔۔مسٹر اور مسز وسوگر بھی علامہ کے عقیدت مند تھے اور وہ ان کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔مسز وسوگر آکسفورڈ یونیورسٹی کی گریجویٹ تھیں اور ان دنوں ڈی۔اے۔وی کالج میں انگریزی کی اعزازی پروفیسر تھیں'' (اقبال کی صحبت میں از عبداللہ چغتائی،ص ۲۱۵۔۱۲۶)

۲۳۔ اقبال کے معاصرین میں سے دلیپ سنگھ کے حوالے سے تین شخصیات کے نام سامنے آئے ہیں۔اس نام کے ایک جج لاہور ہائی کورٹ میں تھے کہ جنہیں بعض اوقات چیف جج بھی سمجھا گیا جب کہ لاہور ہائی کورٹ کی ویب سائٹ پر چیف جج کے طور پر ان کا نام درج نہیں۔انھوں نے گستاخ رسول راج پال کو ماتحت عدالت سے ملنے والی سزا (دو سال قیدِ سخت اور ہزار روپے جرمانہ) سے بری کر دیا تھا کہ جس سے مسلمانوں میں خاصا اشتعال پھیل گیا تھا۔ان کے اس فیصلے کے بعد لاہور میں فسادات کے اندیشے کے تحت حکام نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی تھی۔علامہ اقبال کے ہاں بھی اس فیصلے کے خلاف ردعمل ملتا ہے۔قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دلیپ سنگھ نامی یہ جج اقبال اور ہنس ہاسو کے مشترکہ دوست نہیں ہیں اور حیاتِ اقبال پر لکھی جانے والی کسی بھی کتاب سے اقبال کی ان سے دوستی یا روابط کا کوئی سراغ نہیں ملا۔دلیپ سنگھ نام کی ایک اور شخصیت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیں لیکن ان کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہو گیا تھا،اس لیے وہ بھی ان دونوں کے مشترکہ دوست نہیں ہو سکتے۔

دلیپ سنگھ کے حوالے سے تیسرا نام ایک خاتون شہزادی کا ہے جو بمبا کے نام سے مشہور تھیں۔اپنے والد دلیپ سنگھ اور والدہ کے حوالے سے دلیپ سنگھ بمبا کہلاتی تھیں اور لاہور میں مقیم تھیں۔ان کے ہاں اقبال کا آنا جانا بھی رہا۔مرزا جلال الدین ان ملاقاتوں کا احوال لکھتے ہیں:'' ایک مرتبہ شہزادی دلیپ سنگھ بمبا کی کوٹھی پر جانے کا اتفاق ہوا،سر جوگندر سنگھ،سر ذوالفقار علی خان اور میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔موصوفہ کو ڈاکٹر صاحب سے بہت عقیدت تھی اور وہ انھیں اکثر اپنی کوٹھی پر مدعو کیا کرتیں۔ہم سب بیٹھ گئے تو شاہزادی اٹھ کر برآمدہ میں تشریف لے گئیں اور چند منٹ بعد ایک نفیس حقہ خود اٹھائے ہوئے واپس آئیں اور ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ کر فرمایا کہ شوق کیجیے۔شہزادی اردو نہ جانتی تھیں مگر ڈاکٹر صاحب کے کلام کی بہت مشتاق رہتیں۔ان کی فرمائش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی نظم سنائی،جس کا ترجمہ سر جوگندر نے انگریزی میں کیا'' (ملفوظاتِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی،ص ۱۰۵) جاوید اقبال ان کے بارے میں لکھتے ہیں:''اس (دلیپ سنگھ) کی بیٹی راجکماری بامبا اقبال کے جاننے والوں اور مداحوں میں سے تھی۔ماڈل ٹاؤن لاہور کی ایک کوٹھی میں مقیم تھی،اس کا انتقال پاکستان بننے کے بعد ہوا'' (زندہ رود،ص ۴۵) ہمارا خیال ہے کہ ہنس ہاسو کے خط میں دلیپ سنگھ سے مراد یہی دلیپ سنگھ بمبا ہیں لیکن خط میں ''سر اور لیڈی دلیپ سنگھ'' کے الفاظ مغالطے کا باعث ہیں۔

۲۴۔ یہ اشعار اقبال کی معروف نظم ''ترانہء ہندی'' کے ہیں جو ''بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ علامہ اقبال اور ہنس ہاسو مشرق و مغرب کے مابین گہرے اور دیرپا روابط کے آرزومند تھے۔ اس امنگ کا اظہار ان مکاتیب میں درج اشعار سے بھی ہوتا ہے۔

۲۵۔ علامہ اقبال بہت خوش آواز تھے لیکن عمر کے آخری حصے میں آکر ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اقبال کے سوانحی حالات لکھنے والوں میں سے کم و بیش ہر سوانح نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ تاہم، میرے خیال میں سب سے وقیع رائے ان کے معالج، حکیم محمد حسن قرشی کی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ اس مرض کی نزاکت سے واقف تھے یا پھر خود علامہ اقبال کی رائے کو اہمیت دی جا سکتی ہے کہ وہ اسے جھیل رہے تھے۔ اس مرض کی وجوہ کے بارے میں حکیم محمد حسن قرشی لکھتے ہیں: ''بیگم صاحبہ کی رحلت سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کو ایک خاص تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ملا کر سویاں کھائیں سویاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر آواز نہ کھلی۔ آخر مجبور ہو کر پھر حکیم نابینا صاحب کی طرف رجوع کیا جن کے علاج سے ان کو معتد بہ فائدہ ہوا۔'' (مشمولہ ملفوظاتِ اقبال، ص ۲۸۱)

۲۶۔ علامہ اقبال آسٹریا اور جرمنی میں کچھ معالجین سے رابطے میں تھے اور انھوں نے اپنے کچھ ایکسرے اور رپوٹیں بھی ارسال کی تھیں۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنس ہاسو کو علاج کی غرض سے اقبال کی متوقع آمد کا علم تھا۔ تاہم، اقبال علاج کی غرض سے یورپ نہ جا سکے جس کی ایک نفسیاتی توجیہ بیان کی جا چکی ہے اور جس کی تائید ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کے اس خط سے بھی ہوتی ہے: ''بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے۔ مزید برآں یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہو گی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سالوں میں، جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے، میں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں۔ ایک خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لئے مکہ جاؤں۔'' (خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، ص ۲۷۶۔ اصل خط انگریزی میں ہے کہ جس کا ترجمہ زندہ رود کے ص ۶۶۴ سے لیا گیا ہے)

کتابیات

(اردو کتب)

۱۔ بٹالوی، عاشق حسین: ''اقبال کے آخری دو سال'' کراچی، اقبال اکادمی، بار دوم ۱۹۶۹ء

۲۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر: ''زندہ رود''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۳۔ چغتائی، محمد عبداللہ، ڈاکٹر: ''اقبال کی صحبت میں'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۴۔ چغتائی، محمد عبداللہ، ڈاکٹر: ''روایاتِ اقبال'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۵۔ خالد سنجرانی، طارق عزیز و دیگر (مرتبین): ''اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں'' لاہور، جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء

۶۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر: ''فکرِ اقبال'' لاہور، بزمِ اقبال، ۱۹۶۸ء

۷۔ خورشید، عبدالسلام: ''سرگزشتِ اقبال'' لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء
۸۔ درانی، سعید اختر، ڈاکٹر: ''اقبال۔ یورپ میں'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۹ء
۹۔ رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر و دیگر (مرتبین): ''اقبالیات کے سو سال'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۲ء
۱۰۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر (مرتب): ''ملفوظاتِ اقبال'' لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء
۱۱۔ سالک، عبدالمجید: ''ذکرِ اقبال'' لاہور، بزمِ اقبال (س۔ن) عرض حال یکم جون ۱۹۵۵ء
۱۲۔ عبدالواحد، سید: ''نقشِ اقبال'' لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۹ء
۱۳۔ سید، عطیہ : ''اقبال'' لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۷۵ء
۱۴۔ فقیر، وحیدالدین، سید: ''روزگارِ فقیر'' کراچی، لائن آرٹ، بار ششم ۱۹۶۶ء

(جرمن اور انگریزی کتب)

1. Braybrooke,Marcees: "Intrfaith Originigations 1831 to 1979 A Historical Directory" Edwin Mellen Pr.ND
2. Burgel, J.C : " Iqbal and Europe " Bern, Peter Lang, 1980
3. Chaghatai, M.Ikram: "Iqbal and Tagore" Lahore, Sang e mell publications, 2002.
4. Feinstein,Margarete Myers: "The National Anthem Debate in the Fedral Republic of Germany" in "Central European History " Vol.33,Cambridge University, 2000.
5. Glasenapp,Halmuth:" Meine Lebensreise" Weisbadin,F.A.Brockhaus, 1964.
6. Goetz,Bruno:"Schloss Ostrau" Halle(Salle) Otto Hendel Druckerei,ND
7. Veltheim, Hans Hasso :"Tagebuchar aus Asein" Hamburg, Neue Folge.2.verb.Aufl.1955.
8. Walter, Karl Klaus:" Hans Hasso von Veltheim" Halle, mdv Verlag, 2004.
9. Wintzen, Rene:"Post war German Literature" Hamburg, New Haven,1987.
10. Wolfgang, Kochler:"Mohammad Iqbal and three Realms of spirit" Hamburg,

German Pakistan Forum,1977.

Abstract

Personal letters and documents are considered a basic and reliable source of information about great personalities. The present writer has got the opportunity to discover an unpublished and rare letter of Allama Muhammad Iqbal addressed to one of his German friends Baron von Veltheim Hans-Hasso in the Archives of Wernigerode, a small town near Halle, Germany. This original letter of Iqbal, dated June 30, 1936 is in English and the reply by his German friend, dated July 22, 1936, is in German language. Both letters along with the Urdu translations of the German letter and detailed references are given in this article. It also refers to another German friend of Iqbal about whom the writer has attempted to collect a piece of information which is quite useful in the field of Iqbal's studies and for all who are interested in exploring Iqbal's peculiar association with Germany and German people.

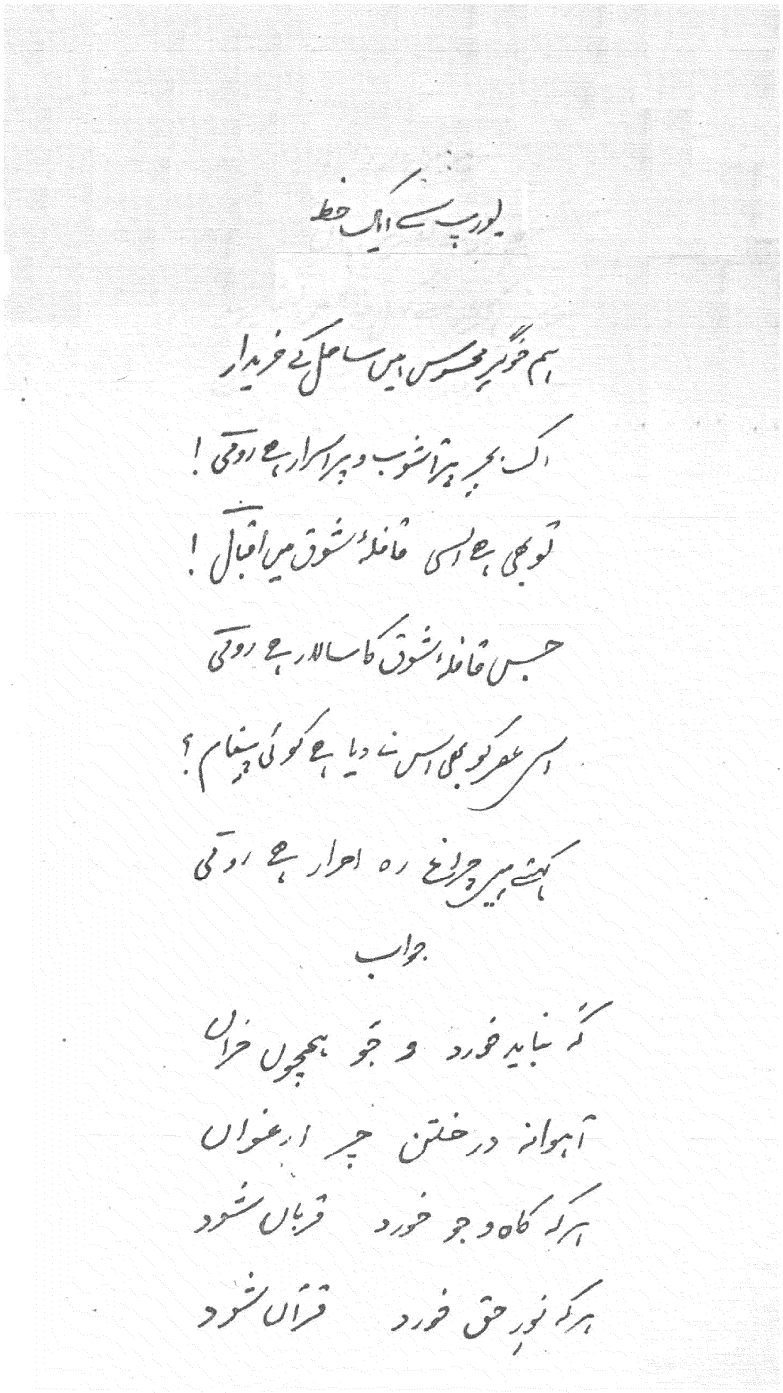

یورپ سے ایک خط

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی!
تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال!
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی
اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام؟
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

جواب

کہ نباید خورد و جو ہمچوں خران
آہوانہ در ختن چر ارغوان
ہر کہ کاہ و جو خورد قربان شود
ہر کہ نورِ حق خورد قرآن شود